سید شمیم احمد

مکتوبات مخدوم الملک

توحید اور فنا فی التوحید

وحدت الوجود اور وحدت الشہود وغیرہ تصوف کے اہم مسائل ہیں۔ مخدوم الملک نے ان مسائل کو شریعت کی حدود کے اندر نہایت عارفانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

قاضی شمس الدین کو لکھتے ہیں:[2]

از روئے شریعت و طریقت حقیقت و معرفت اجمالاً توحید کے چار درجے

ذرہ نیست ہو جاتا ہے بلکہ جہاں آفتاب کی پوری روشنی ہو گی ذروں کو چھپ جانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ جس وقت روشن دان و تابدان وغیرہ سے دھوپ کوٹھری یا سائبان وغیرہ میں آتی ہے اس وقت ذروں کا تماشا دیکھو صاف نظر آتے ہیں، پھر آنگن میں نکل کر دیکھو غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بندہ خدا نہیں ہوتا اور نہ بندہ نیست ہوتا ہے۔ نابود ہونا اور چیز ہے نظر نہ آنا اور شئی ہے۔

پیش توحید او نہ کہنہ نہ نو ست　　ہمہ ہیچ اند ہیچ اوست کہ اوست
کے بود ما ز ما جدا ماندہ　　من و تو رفتہ و خدا ماندہ

یا یوں سمجھو کہ عالم ایک آئینہ ہے اس آئینے میں سالک کو بعض بعض وقت خدا ہی نظر آتا ہے۔ خدا کے مشاہدے میں سالک ایسا مستغرق ہو جاتا ہے کہ عالم جو آئینہ حیرت ہے

ہیں اور ہر درجہ میں اہل توحید کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں

توحید کا پہلا درجہ: ایک گروہ فقط زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے مگر دل سے رسالت و توحید حق کا منکر ہے۔ ایسے لوگ زبان شرع میں منافق کہے جاتے ہیں۔ یہ توحید مرنے کے وقت یا قیامت میں کچھ فائدہ بخش نہ ہوگی۔

توحید کا دوسرا درجہ: اس کی دو شاخیں ہیں۔ ایک گروہ زبان سے بھی لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے اور دل میں بھی تقلیداً اعتقاد رکھتا ہے یہ گروہ عام مسلمانوں کا ہے۔ دوسرا گروہ زبان سے بھی کہتا ہے دل میں بھی اعتقاد صحیح رکھتا ہے اور خدا کی وحدانیت پر دلیلیں بھی رکھتا ہے۔ اس جماعت کے لوگ متکلمین یعنی علمائے ظواہر کہلاتے ہیں۔ عام مسلمانوں و متکلمین کی توحید وہ توحید ہے کہ شرک جلی سے نجات پانے کا باعث ہے۔ سلامتی و ثبات آخرت سے ملحق ہے۔ خلود دوزخ سے رہائی، بہشت میں داخل ہونا اس کا ثمرہ ہے۔ مگر اس توحید میں مشاہدہ نہیں ہے۔ اس لیے ارباب طریقت کے نزدیک اس توحید سے ترقی نہ کرنا اور ادنیٰ درجہ پر قناعت کرنا ہے۔

توحید کا تیسرا درجہ: بندہ کے دل میں ایک نور پیدا ہوتا ہے، اور اس نور سے وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ فاعل حقیقی وہی ایک ذات ہے۔ سارا عالم گویا کٹھ پتلی کی طرح ہے کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ ایسا موحد کسی فعل کی نسبت کسی دوسری طرف نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ فاعل حقیقی کے سوا دوسرے کا فعل نہیں۔ یہ توحید عامیانہ و متکلمانہ نہیں بلکہ عارفانہ ہے دل میں نور الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔

توحید کا چوتھا درجہ: سالک نور باطن سے ترقی کر کے اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ بعض کل موجودات میں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو کچھ نظر نہیں آتا۔ تجلیات حقانی کا ظہور سالک کے دل پر اس شدت سے ہوتا ہے کہ ساری کائنات اس کی نظر میں گم ہو جاتی ہے۔ جس طرح ذرے آفتاب کی روشنی میں نظر نہیں آتے۔ دھوپ میں جو ذرہ دکھائی نہیں دیتا اس کا سبب یہ نہیں کہ

ہے اس کو نظر نہیں آتا۔ اس سے اور آسان مثال سنو۔ تم خود آئینہ دیکھو اور اپنے جمال میں محو ہو جاؤ۔ پھر دیکھو تو سہی آئینہ تمھاری نظر سے ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں۔ ضرور ساقط ہو گا۔ ایسے موقع پر کیا تم کو یہ کہنے کا حق ہو گا کہ آئینہ نیست ہو گیا یا آئینہ جمال ہو گیا، یا جمال آئینہ ہو گیا۔ ہرگز نہیں۔ نیست ہونا اور ہے اور نہیں دکھائی دینا اور ہے۔ جس کی نظر میں آفتاب انوار حق اس شان سے ظہور کرے گا اس کی نظر میں ساری ہستیاں کم نہ ہوں گی تو کیا ہوں گی۔ قدرت کا مقدورات میں دیکھنا بلا فرق اسی طرح پر ہوتا ہے صوفیوں کے ہاں اس مقام کا نام الفنا فی التوحید ہے۔

"فنا فی التوحید کے بعد ایک مرتبہ ہے جس کا نام الفنا عن الفنا ہے ..... اس مرتبہ میں سالک کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کمال استغراق کی وجہ سے اس کے احساس کو اپنی فنائیت کی خبر نہیں ہوتی اور نہ اس کی آگاہی باقی رہتی ہے کہ ہم فنا ہوئے۔ یہاں تک جمالی و جلالی تجلی کا فرق بھی نظر نہیں آتا۔"

"توحید وجودی علم کے درجہ میں ہو یا شہود کے ابتدائی درجے سے انتہائی درجے تک پہنچے۔ ہر حال میں بندہ بندہ ہے اور خدا خدا ہے۔ اسی لیے انا الحق اور سبحانی ما اعظم شانی وغیرہ کہنا اگر صدق حال نہ ہو تو اہل طریقت کے نزدیک یہ کلمات کفریہ ہیں۔ اور جہاں صدق حال ہے وہاں بے شک کمال ایمان کی دلیل ہے۔"

مخدوم الملک خدا کے بندے میں حلول کرنے کے نظریہ کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ خدا کی تجلی ہوتی ہے اور خدا اپنا جلوہ دکھاتا ہے مگر وہ انسان میں حلول نہیں کرتا۔"

یہ غلط اور باطل اعتقاد عجمی و ہندی تصوف کی آمیزش سے پیدا ہوا ہے۔ خود اہل عجم اور ہندوؤں کے ہاں بھی عقیدہ بعد میں اس وقت پیدا ہوا جب کہ ان کے

بزرگوں کی تعلیمات میں تحریف کی گئی۔ بعض مسلمان صوفیوں نے بھی وحدت الوجود کے مسئلہ کو ایسا ہی یا اس سے ملتا جلتا سمجھا۔ حالانکہ وحدت الشہود اور وحدت الوجود کے نظریات میں کوئی تضاد و اختلاف نہیں۔ دونوں میں جو فرق نظر آتا ہے وہ بنیادی نہیں، ارتقائی ہے۔ یعنی وحدت الشہود توحید کا تیسرا اور وحدت الوجود چوتھا درجہ ہے۔

تصوف

تصوف کے بارے میں کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ یہ ویدانت، عجمیت اور عیسائیت کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض چیزیں غلط ضرور ہیں۔ یہ کم علمی کی وجہ سے یا مقامی اثرات کی وجہ سے شامل ہو گئی ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر تصوف کو غیر اسلامی فلسفہ کہنا صحیح نہیں۔ تصوف کیا ہے۔ اس کی بنیاد کہاں سے ہے اور اصل اسلامی تصوف کی کیا حیثیت ہے۔ ان سب کی مخدوم الملک یوں وضاحت فرماتے ہیں:

"برادرم اعز شمس الدین اعزاللہ۔ تم ایسا ہرگز نہ سمجھو کہ تصوف کا قاعدہ قانون کوئی نیا اور من گھڑت شے ہے بلکہ یہ ایک قدیمانہ دستور العمل ہے جس پر انبیاء علیہم السلام اور صدیقوں کا عملدر آمد رہا ہے۔ اس زمانے میں جو لوگ تصوف اور صوفیا پر ہنستے ہیں اور ان کی پاک دامنی پر دھبے لگاتے ہیں اس کا خاص سبب یہ ہے کہ صوفیوں نے خود اپنی روش بدل کر خلاف اصول عادات میں مبتلا ہو کر تصوف کو بدنام کرنے کا موقع دیا ہے ورنہ سبحان اللہ تصوف دین و ایمان کی جان ہے۔ اہل طریقت کے نزدیک تصوف کی تین قسمیں ہیں۔ صوفی، متصوف اور متشبہ۔

صوفی کی تعریف یہ ہے کہ اپنی ہستی سے فانی ہے اللہ کے ساتھ باقی ہے۔ خواہشات

لہ مکتوبات ۲۲ مکتوبات صدی

نفسانی کے قبضہ سے باہر ہے۔ حقائق موجودات کا ماہر ہے۔

متصوف کی شان یہ ہے کہ مجاہدہ وریاضت میں اس لیے مشغول و سرگرم ہے کہ صوفیوں کے مراتب حاصل کرے اور قدم بقدم صوفیوں کے چل رہا ہے۔

متشبہ کی حالت یہ ہے کہ صورتاً تو اس میں صوفیوں کے اکثر عادات ہیں۔"

"تصوف[۵] کی دولت ایک نبی سے دوسرے نبی کو پہنچتی رہی۔"

رسول اکرمؐ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خود[۶] مسجد نبوی میں ایک گوشہ معین کر دیا۔ اصحاب میں سے وہ گروہ جو سالکان راہِ طریقت بعنوان خاص تھے۔ وہیں ان سے راز کی باتیں ہوا کرتیں۔ ان میں سے بعض پیر تھے بعض ان میں سے کامل تھے جیسے ابوبکر، عمر، عثمان، علی و سلمان رضی اللہ عنہم۔ اور معاذ، بلال عمار رضی اللہ عنہم ان حضرات کو خاص خاص اوقات میں آپؐ وہاں بٹھاتے اور اسرار کی ایسی ایسی باتیں ہوتیں کہ بڑے بڑے فصحائے عرب اور عام صحابہ ان کے مقر کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس خاص جماعت صوفیہ میں تقریباً ستر آدمی تھے۔ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی معمول تھا کہ جب کسی صحابی کی عزت و تکریم کرتے تو انھیں ردائے مبارک یا اپنا پیراہن شریف عنایت فرماتے۔ صحابہ میں وہ شخص صوفی سمجھا جاتا۔"

ولایت و نبوّت

قاضی صدر الدین کے نام مکتوبات میں ولایت کی تشریح اور ولایت و نبوت کے فرق کو یوں سمجھایا گیا ہے:

"ولایت[۷] عام ایمان کو کہتے ہیں۔ جو شخص ایمان لایا وہ اولیاء اللہ سے ہوا۔ مگر یہ ولایت

[۱،۲،۵] مکتوب ۲۲ مکتوبات صدی ص ۶۳، [۳] مکتوب ۹ مکتوبات صدی ص ۲۵، [۴] مکتوب ۵ مکتوبات ص ۵، ص ۲۲، [۵] مکتوب ۲ مکتوبات دو صدی ص ۵۴

عام ہے ممکن ہے کہ اوامر کو ترک کرے اور نواہی کا مرتکب ہو۔

دوسرا درجہ وہ ہے کہ اوامر بجا لائے اور نواہی سے پرہیز کرے۔ ایسا شخص بھی خدا کے ولیوں میں ضرور شامل ہے مگر عام ولی مومن کے مقابلہ میں اس کو خصوصیت حاصل ہے۔ تیسرا درجہ خاص الخاص کا ہے۔ یعنی ولی مومن اوامر کی تعمیل کرے اور نواہی سے دور رہے۔ اس کے علاوہ اپنی جملہ مرادوں سے منہ پھیر لے۔ اس کی نگاہ اس پر نہ ہو کہ ہم کیا کریں بلکہ اس تاک میں رہے کہ دوست کیا چاہتا ہے۔۔۔۔"

"ولی بہرحال جملہ دینی صعوبتوں اور گناہ سے محفوظ رہتا ہے کیونکہ گناہ کا ارتکاب سخت ترین جرم ہے۔ ولی کو حق تعالیٰ ہر طرح کی ذلت و معصیت سے بچائے رکھتا ہے۔ جس طرح پیغمبر کی یہ شان ہے کہ معصوم ہو اسی طرح ولی وہ ہو سکتا ہے جو محفوظ ہو۔ معصوم اور محفوظ کا فرق بھی سمجھ لو۔ معصوم اسے کہتے ہیں جس سے کبھی کسی قسم کا گناہ سرزد نہ ہوا ہو اور محفوظ اسے کہتے ہیں جس سے شاذ و نادر کبھی گناہ ہو جائے مگر اس کو گناہ پر اصرار نہ ہو"[۱]

اس کے بعد قاضی شمس الدین کے نام ایک مکتوب میں اس خام خیالی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ولی کو نبی پر فضیلت ہے،

" تمام اولیاء نبیوں کے تابع ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کو اولیاء پر فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ ولایت کی جو انتہا ہے وہ نبوت کی ابتداء ہے۔ ہر نبی درجہ ولایت پر فائز ہے مگر کوئی ولی نبی نہیں ہو سکتا۔ اس امر میں علمائے سنت و الجماعت ہوں یا محققین اہل طریقت ہوں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ سب کے سب متفق ہیں مگر ملحدوں کا ایک گروہ اولیاء کو انبیاء پر فضیلت دیتا ہے"

---

[۱] مکتوب نمبر ۲ مکتوبات دو صدی ص ۵۴

عام طور سے لوگ کرامات کا اظہار کرنے والے کو زیادہ بڑا بزرگ اور ولی سمجھتے ہیں حالانکہ خود اولیائے کرام اظہار کرامت کو برا سمجھتے رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس صفت سے نوازا ہے مگر خود وہ عالم جذب میں یا غیر ارادی طور پر کرامت کا اظہار کرتے ہیں اور اظہار کے بعد ندامت و حجاب محسوس کرتے ہیں۔ مخدوم الملک فرماتے ہیں:

"ولی ہونا اور کرامت پر نظر رکھنا صفت ضدین ہیں۔ ولی ہوگا تو کرامت پر نظر نہ ہوگی۔ کرامت پر نظر ہوگی تو ولی باقی نہ رہے گا۔"[1]

شریعت و طریقت

مخدوم الملک تا زندگی شریعت کے اصولوں پر سختی سے پابند رہے۔ وہ شریعت کی پابندی کے بغیر طریقت کے قائل نہیں،

"جب[2] تک ہوش و خرد باقی ہے شریعت کی پابندی کا حکم بھی باقی ہے۔ جو اس کا منکر ہے اس کے متعلق مشائخ طریقت اور علمائے حق کا اجماع و اتفاق ہے کہ وہ دین اسلام سے باہر ہے۔"

"شریعت[3] کے بغیر طریقت کا قصد کرنا ویسا ہی ہے جیسے ایک شخص کوٹھے پر چڑھنا چاہے اور سیڑھی توڑ ڈالے۔ دیوار پکڑ کر اوپر چڑھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دو چار ہاتھ بمشکل جا سکے گا پھسل کر گرے گا۔"

شریعت و طریقت میں کیا فرق ہے اس کو قاضی شمس الدین کے نام ایک

---

[1] مکتوب ۸ مکتوبات صدی ص ۲۴

[2] مکتوب مکتوبات صدی

[3] مکتوب ۲۵ مکتوبات صدی ص ۸۲

میں اس طرح سمجھاتے ہیں،

"شریعت[1] میں توحید، طہارت، نماز، روزہ، حج، جہاد، زکوٰۃ اور دوسرے احکام شرع و معاملات ضروری کا بیان ہے۔ طریقت کہتی ہے کہ ان معاملات کی حقیقت دریافت کرو۔ ان کی تہہ تک پہنچو۔ اعمال کو قلبی صفائی سے آراستہ کرو۔ اخلاق کو نفسانی کدورتوں سے پاک رکھو جیسے ریاکاری، ہوائے نفسانی، ظلم و جور اور شرک و کفر وغیرہ۔ اچھا اس طرح سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھو کہ ظاہری طہارت۔ ظاہری تہذیب سے جس امر کو تعلق ہے وہ شریعت ہے۔ تزکیہ باطن اور تصفیہ قلب سے جس کو لگاؤ ہے وہ طریقت ہے۔ کپڑے کو دھو کر ایسا پاک کرنا کہ اس کو پہن کر نماز پڑھ سکیں فعل شریعت ہے اور دل کو کدورت بشری سے پاک رکھنا فعل طریقت ہے۔ ہر نماز کے لیے وضو کرنے کو ایک ایک فعل شریعت سمجھو اور ہمیشہ باوضو رہنا طریقت کا دستور العمل خیال کرو۔

نماز میں قبلہ رو کھڑا ہونا شریعت ہے اور دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہونا طریقت ہے۔ حواس ظاہری سے جن معاملات دینی کا تعلق ہے اس کی رعایت کو ملحوظ رکھنا شریعت ہے اور جن معاملات دینی کو قلب و روح سے تعلق ہے اس کی رعایت کرنا طریقت ہے۔"

پیر کی ضرورت

حضرت مخدوم الملک شریعت و طریقت کے معاملات میں پیر، مرشد یا شیخ کی رہنمائی ضروری سمجھتے ہیں۔ جس طرح کوئی مریض اپنا علاج خود کر کے نقصان اٹھاتا ہے اسی طرح مرشد یا شیخ کے بغیر صرف اپنی عقل و سمجھ سے کام لے کر یا بزرگوں کی کتابوں کا مطالعہ کر کے کوئی شخص منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

آپ کا خیال ہے کہ جس طرح امت کے لیے پیغمبر، طفل شیر خوار کے لیے دایہ اور

---

[1] مکتوب ۲۳ مکتوبات صدی ص ۶۵

طالب علم کے لیے استاد کی ضرورت ہے اسی طرح مرید کے لیے پیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ پیر اپنے مرشد کو گمراہ ہونے سے بچاتا ہے اور ہوشیاری سے راستے طے کراتا ہے مرشد کے بغیر مرید کو قدم قدم پر پھسل جانے کا اندیشہ ہے[1]" دیکھو پیر کی ضرورت کس قدر ہے۔ نقل ہے کہ حضرت خواجہ ابو سعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید وضو کر کے اپنے حجرے میں داخل ہوئے۔ ایک نور نظر آیا۔ دیکھتے ہی چلا اٹھے کہ اللہ کو دیکھا۔ پیر نے سنا تو فوراً سمجھ گئے کہ مرید کو اس وقت وضو کا ہوا ہے۔

حاضر ہوئے اور فرمایا۔ ارے نادان و ناواقف وہ نور تیرے وضو کا تھا۔ کہاں تو اور کہاں جمال خداوندی۔ نہ دیکھیں حضرت موسیٰ اور دیکھے تجھ سا مبتدی۔

اس مقام پر اکثر سالک مغرور ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تجلی حق دیکھی۔ اگر شیخ کامل و صاحب تصرف نہ ہو تو اس مہلک بھنور سے نجات مشکل ہے۔ بے پیر اور بے علم اس مقام میں پہنچ کر ایسا مغرور ہو جاتا ہے اور ایسا مکار و شیطان بن جاتا ہے کہ سارے جہان کو دعویٰ باطل سے بھر دیتا ہے اور سنی سنائی باتوں کو یاد کر کے اول فول بکتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ ہم منزل مقصود تک پہنچ چکے۔ غضب تو یہ ہے کہ اس کو تصرف و کرامت کا بھی دعویٰ پیدا ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خدا کی مملکت میں ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ آخر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اباحت و زندقہ میں پڑ جاتا ہے۔"

شیخ کے اوصاف

پیر و مرشد یا شیخ کے اوصاف کے سلسلہ میں مخدوم الملک کا خیال ہے کہ وہ سالک ہو مجذوب نہ ہو۔ مجذوب سے کسی تعلیم و تربیت کی امید نہیں کی جا سکتی۔ آپ مجذوب کو پیر بنانے کے لائق ہی نہیں سمجھتے کیونکہ اس کے مقامات بے ہوشی میں طے

---

[1] مکتوب ۲۳ مکتوبات صدی ص ۶۵

ہوتے ہیں۔ خود آپ نے اپنے معاملہ میں اسی اصول پر عمل کیا۔ جب پیر کی تلاش میں اور بیعت کے ارادے سے دہلی گئے تو حضرت بوعلی شاہ قلندر سے ملنے پانی پت بھی تشریف لے گئے۔ آپ ان کی بزرگی سے تو بہت متاثر ہوئے مگر مرشد بنانے کے لائق نہیں سمجھا۔ فرمایا "شیخ است اما مغلوب الحال است بہ تربیت دیگرے نمی پردازد۔"

سالک چونکہ ہر مقام سے آگاہ ہوتا ہے اس لیے وہ مرید کو بھی ہر خطرہ سے بچاتا رہتا ہے۔ مخدوم الملک پیر کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ،

"جتنے مقامات اور جتنی پسندیدہ خصلتیں قرآن مجید یا حدیث شریف میں مذکور ہیں اس شخص میں پائی جائیں۔" لیکن پھر یہ بھی سمجھاتے ہیں کہ شریعت کی پابندی اور قرآن و احادیث کی پسندیدہ خصلتوں کا مطلب یہ نہیں کہ پیر بالکل معصوم ہو اس سے کبھی کوئی خطا سرزد نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ کوئی انسان سوا پیغمبروں اور ولیوں کے معصوم و محفوظ نہیں۔ اس لیے،

"پیر[1] ہونے کی شرط یہ نہیں کہ وہ معصوم ہو بلکہ یہ ہے کہ وہ اس راہ کے کاموں کی حقیقت کو جان چکا ہو اور خدا کی راہ میں سفر کر چکا ہو۔ ٹھیک اسی طرح جیسے تم کسی سے علم سیکھنا چاہو تو یہ شرط نہیں کہ وہ معصوم ہو بلکہ شرط یہ ہے کہ وہ اس علم میں کامل ہو۔ معصوم ہونا نبیوں کے لیے مخصوص ہے وہ ضرور معصوم تھے۔ پیروں کے لیے نہیں۔"

رضائے الٰہی

ہر حال میں انسان کو خدا کی مرضی کے تابع رہنا چاہیے کیونکہ یہی خالق کی خوشنودی حاصل کرنے کا راز ہے۔ علاوہ اس کے بندے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ بھی

---

[1] مکتوب ۱۵، مکتوبات دوصدی ص ۳۷۴

نہیں۔ راضی برضائے الٰہی کے فلسفہ کو مخدوم الملک یوں سمجھاتے ہیں:

"برادر عزیز! حقوق کی ادائیگی میں جیسا کہ شریعت نے مقرر کیا ہے پوری کوشش کرنی چاہیے اور اسے اپنی راہ سلوک سمجھیں۔ سلوک صرف روزہ، نماز اور حج نہیں ہے۔ حکم الٰہی کی پابندی میں جو کچھ بھی کرنا پڑے وہ سب سلوک ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مٹھی مٹی ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو۔ اے بھائی! ہمیں تو رضائے الٰہی چاہیے۔ سوال نہ مکے کا ہے نہ مدینے کا نہ مسجد کا نہ بت خانہ کا نہ حجلہ عروسی کا نہ دین و مذہب کا نہ مجاہدہ و ریاضت کا۔ مسافرت و قیام کی بھی قید نہیں۔ طالبانِ حق کا یہی مشرب ہے، اسی پر قائم رہو۔۔۔۔۔"

"اے بھائی عبادت میں مزدوری اور بدلہ نہیں طلب کرنا چاہیے نہ اس آرزو میں عبادت کرنی چاہیے۔ ہم بندہ ہیں۔ مفلسی اور بے چارگی کے ساتھ بندگی فرض سمجھ کر اس میں پیہم لگے رہنا چاہیے۔"

"اے عزیز! انبیاء اور اولیاء بادشاہ و امرا سب کے سب بہت سی چیزیں چاہتے ہیں مگر وہ نہیں ہوتیں اور بہت سی چیزیں جو نہیں چاہتے ہیں ہو جاتی ہیں۔ جب ان کا یہ حال ہے تو ہمارا تمھارا کیا۔ یہی لازم ہے کہ جو ہمیں ملا ہے اسی پر راضی ہو جائیں اور سر تسلیم خم کر دیں۔ اپنی بندگی پیش کر دیں اور بس۔ کیونکہ یہ تو بہر حال کرنا ہی ہے۔ برضا یا بجبر۔ جیسے انسان کو موت سے چھٹکارا نہیں قانون الٰہی کے سامنے گردن جھکانے کے سوا چارہ نہیں۔ وہی ہوگا جو اس کی خواہش ہے۔ پھر اپنی خواہش کو درمیان میں لاکر بربادی کی راہ اختیار کرنا بے کار ہے۔ کیسی شان ہے اس پروردگار کی۔ سبحان اللہ۔"

---

۱ و ۲ مکتوب ۲۶ مکتوبات دوصدی ص ۳۹۸-۹۹

۳ مکتوب ۵۶ مکتوبات دوصدی ص ۴۴۲

توبہ

خطا و گناہ کا سرزد ہو جانا انسان کی فطرت میں شامل ہے لیکن اس کے ارتکاب کے بعد توبہ نہ کرنا زیادہ سنگین ہے۔ توبہ کا مطلب جرم کا اقرار اور اس پر اظہار ندامت کرنا ہے۔ ساتھ ہی خدا سے معافی طلب کرنا۔ آئندہ اس فعل سے بچنے کا عہد و عزم کرنا ہے۔

مگر ایک نکتہ اور غور طلب ہے یعنی توبہ صرف گناہگار ہی کے لیے ضروری نہیں پیغمبروں اور ولیوں نے بھی ہمیشہ توبہ و استغفار کی ہے۔ حالانکہ وہ معصوم اور گناہوں سے محفوظ تھے۔ اس کا راز یہ ہے کہ عوام کی توبہ گناہ سے معافی طلب کرنے کے لیے ہوتی ہے اور خواص کی توبہ بطور اظہار تشکر ہوتی ہے۔ اس سے ان کے درجات میں مزید ترقی ہوتی ہے۔

توبہ اور اس کے اسرار و فوائد کو حضرت مخدوم نے یوں بیان فرمایا ہے،

"[۱] درویش پیشیخ عمر اسلام و دعا مخصوص ہے۔ اے بھائی گناہ سے پاک ہونا پیدائش سے آخر تک فرشتوں کی صفت ہے۔ پیدائش سے آخر تک گناہ سے آلودہ رہنا شیطان کا کام ہے۔ گناہ کر کے توبہ کرنا حضرت آدم اور ان کی اولاد کی فطرت ہے۔"

"[۲] آدمی کی پکڑ گناہ پر نہیں ہوتی بلکہ گناہ سے توبہ نہ کرنے پر ہوتی ہے۔"

"[۳] توبہ اگر صرف گناہ ظاہری سے ہوتی تو پیغمبروں کو توبہ کی حاجت نہ تھی وہ تو گناہ صغیرہ و کبیرہ سے پاک تھے۔ مگر ان حضرات سے بھی توبہ ثابت ہے، اور اپنی جگہ ٹھیک ہے۔"

---

[۱] و [۲] مکتوب [illegible] مکتوبات دو صدی

[۳] مکتوب [۲] مکتوبات صدی

"عوام[1] کی توبہ اس لیے ہوتی ہے کہ ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے نا۔ فرمانی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو معاف کرے تاکہ عذاب سے بچیں۔ خاص لوگوں کی توبہ اس لیے ہوتی ہے کہ جس قدر نعمتیں عطا ہوئی ہیں۔ رحم و کرم ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس اعتبار سے مطلق خدمت ادا نہیں ہوئی ہے۔"

توبہ کا مفہوم اور فوائد سمجھاتے ہوئے آپ قاضی شمس الدین کو یوں ہدایت کرتے ہیں:

"اے[2] بھائی! کیا کہیں۔ اجل تاک میں ہے جو دم آدمی زندہ ہے غنیمت ہے۔ اس وقت کی قدر کرنا چاہیے کیا معلوم کس وقت ملک الموت پہنچ جائے توبہ سے غافل نہ رہو۔ ایک بوڑھا آدمی کسی بزرگ کی خدمت میں پہنچا اور بولا میرے گناہ کی انتہا نہیں ہے میں چاہتا ہوں کہ اب توبہ کرلوں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اے بوڑھے تم چوک گئے۔ آنے میں دیر لگا دی۔ تمھیں جوانی میں آنا تھا۔ مگر بوڑھا صحبت یافتہ تھا اور توبہ کے فوائد سن کر آیا تھا۔ کہنے لگا حضرت دیر سے کیا واسطہ میں تو جلد سے جلد آیا ہوں۔ اے جناب توبہ وہ نعمت ہے کہ اگر مرنے سے قبل نصیب ہو جائے تو کیا کہنا ہے۔ دیر ہونا بھی عین جلدی ہے۔ میں جلد سے جلد آیا ہوں۔ میرے بھائی ہر چند تم گناہ سے آلودہ اور ملوث ہو رہے ہو توبہ تو کرو دیکھو یہ کتنی امید افزا ہوتی ہے۔"

دشمنوں کو خوش کرنا

گناہوں میں حق العباد اس اعتبار سے بڑا سخت ہے کہ اس کی معافی کے لیے خدا کے ساتھ ساتھ بندے کو بھی راضی کرنا پڑتا ہے۔ اس گناہ سے توبہ اور بندے کو راضی کرنے اور دشمن کو خوش کرنے کے بارے میں مخدوم الملک جو طریقہ بتاتے ہیں وہ احکام شرع

---

[1] و [2] مکتوب ۲ مکتوبات صدی

کے مطابق ہونے کے ساتھ ہی نفسیات انسانی کے مطابق بھی ہے۔ آپ اپنے مرید قاضی شمس الدین کو لکھتے ہیں کہ:

"تیسرا گناہ حق العباد ہے، اور یہ نہایت سخت و دشوار ہے۔ اس کے چند طریقے ہیں۔ جان و مال، ذاتیات، عورت، لونڈی اور دین کے نقصانات۔ اگر تم نے مال کا گناہ کیا اور تمھیں اس کی واپسی کی قدرت ہے تو تم پر واجب ہے کہ اس کو لوٹا دو۔ اگر ادائیگی سے مجبور ہو تو معافی چاہو۔ اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہو سکیں تو اس رقم کو اس کی روح پر صدقہ کر ڈالو۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو نیکیاں کرو اور الحاح و زاری کے ساتھ خدا سے معافی مانگو۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کرم سے قیامت کے دن تمھارے دشمن کو تم سے خوش کر دے۔

اگر تم نے کسی کی جان ماری ہے تو اس کے اقربا سے کہہ دو کہ وہ یا تو تم سے قصاص لیں یا معاف کر دیں۔ اگر یہ ناممکن ہو تو تضرع و زاری کے ساتھ خدا کی طرف رجوع کرو کہ قیامت میں تمھارے دشمن کو خوش کر دے۔

اگر تم نے ذاتیات کے نقصان پہنچائے ہیں۔ کسی کی غیبت کی، تہمت جوڑی، گالیاں دیں تو یہ لازم ہے کہ اس سے جا کر کہو کہ بھئی ہم نے تمھاری طرف جھوٹی باتیں لگائی ہیں معاف کرو مگر ذرا سوچ سمجھ کر ایسا نہ ہو کہ اس کا غصہ بھڑک اٹھے اور لینے کے دینے پڑ جائیں کیونکہ جہاں اشتعال، غیض و غضب کا یقین ہو وہاں یہی اچھا ہے خدا کی درگاہ میں سر رگڑو اور معافی کے خواستگار رہو۔ اگر تمھارا دشمن زندہ نہ ہو تو اس کی روح پر ایصال ثواب کرو۔

اگر تم نے کسی کی بیوی یا شرعی لونڈی کے ساتھ بدنیتی کی ہے یا اس سے بھی تجاوز

لہ مکتوب ۳۱ مکتوبات صدی ص ۹

کر گئے ہو تو یہ موقع نہ معافی کا ہے اور نہ ظاہر کرنے کا۔ بہتر یہی ہے کہ اس معاملہ کو خدا ہی کے حوالہ کر دو تاکہ وہ قیامت کے روز اس کو تم سے راضی مند اور خوش کر دے۔"

قاضی شمس الدین سے کسی کے معاملہ میں کچھ زیادتی ہو گئی تھی۔ اس کی خبر مخدوم الملک کو ہوئی تو فوراً تنبیہ کا خط لکھا اور حقوق العباد کی اہمیت سمجھائی،

"اے برادر[1] جب تمہارا شمار درویشوں میں ہے تو مجھے یہ خبر اچھی نہیں معلوم ہوئی کہ تم کو کسی سے شکایت ہو یا تم پر کوئی لعن طعن کرے۔ سوال یہ ہے کہ تم عزیز سے اپنے ذاتی معاملہ میں کوئی ایسا کام کیوں سرزد ہوا جو تمہارے لائق نہ تھا۔ اگر صورت حال یہ ہے کہ خود تم پر ظلم و تعدی کی گئی ہے تب بھی اسے جانی و مالی طور پر برداشت کرنا چاہیے اور کوئی بات نہیں کرنی چاہیے جو دوسروں کو ناگوار معلوم ہو۔"

"اے عزیز[2] تمہارے ذاتی معاملے میں اگر کسی کو کسی طرح سے ایذا پہنچی ہے تو کوشش کرو کہ وہ شخص تم سے راضی ہو جائے کیونکہ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ بندے کا حق خدا کے حق سے بھی زیادہ ہے۔ خدا کا حق تو توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتا ہے مگر مخلوق کا حق جب تک وہ راضی نہ ہو ادائیگی مشکل ہے۔

اے عزیز معلوم ہے شہید کا کتنا بڑا درجہ ہے؟ وہ خود دوسروں کی شفاعت کا حقدار ہو گا لیکن بندے کا حق اگر اس پر کچھ رہ گیا ہے تو اس کی وجہ سے خود اس کا اپنا معاملہ اٹک جائے گا جب تک کہ وہ اس شخص کو راضی نہ کر لے۔ غرضکہ حقوق العباد بہت اہم ہے۔"

دنیا کی مذمت

تمام صوفیائے کرام نے دنیا کی مذمت کی ہے اور لوگوں کو اس سے دور رہنے کی

---

[1] و [2] مکتوب نمبر ۳ مکتوبات دوصدی

تلقین کی ہے۔ مخدوم الملک ایک مکتوب میں دنیا کی بے وفائی کی شکایت اور اس کی مذمت بڑے لطیف انداز میں کرتے ہیں۔ اس مکتوب میں ادیبانہ رنگ بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

"کارِ عالم جز طلسم و پیچ نیست جز خرابی در خرابی ہیچ نیست
از طلسم او نہ شد آگہ کسے درمیانِ خاک و خوں وارد بسے

اے بھائی! دنیا دھوکہ باز، فریبی اور بہروپیا ہے۔ شہد دکھا کر زہر دینے والی ہے۔ صبح میں اگر کسی پر نوازش کرتی ہے تو شب میں جدائی اختیار کرتی ہے۔ دن میں اگر خطرے سے نکالتی ہے تو رات کی تاریکی میں پاؤں سے لنج کر دیتی ہے۔ اس کا آبگینہ غبار آلود ہوتا ہے اور اس کا پیالہ نیش زنبور سے خالی نہیں ہوتا۔ کتنا سچ کہا ہے کسی نے:

از جام او مچش کہ در انجام زہر ہاست گل برگ او مبو کہ دراں زہر و خار ہاست
دہر ستیزہ کار ندارد وفائے کس دیدیم و آزمودہ شنیدیم بارہاست

اے عزیز! ہوشیار۔ یہ بوڑھی دلالہ ہے۔ اس نے کتنے بادشاہوں کو دلہن بن کر قتل کیا ہے۔ یہ اپنے عاشقوں کو ہمیشہ بےکار کر دیتی ہے۔ اس نے جب کبھی کسی کو دیا واپس لے لیا۔ کسی پر عنایت کی تو دوگنا تاوان بھی طلب کیا۔ مثنوی:

دہد لیستاند و عارے ندارد بجز داد و ستد کارے ندارد
چہ بخشد مر ترا ایں سفلہ ایام کہ یک یک باز لیستاند سر انجام

اے عزیز! دنیا ایک جادوگر ہے۔ اس کی زیب و زینت مثل خواب ہے۔ اس کا لباس، اس کی غذا محض خیالی ہے۔ اس کی لذت و خواہش کی انتہا نجاست

لہ مکتوب ع۵۳ مکتوبات دوصدی

ہے۔ افسوس پھر بھی ایک عالم اس کے پیچھے سرگرداں اور پریشاں ہے۔ رباعی:

حال دنیا را بہ پرسیدم من از فرزانۂ
گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانۂ
باز گفتم حال آں کس کو کہ دل در وے بہ بست
گفت یا غولیست یا دیویست یا دیوانۂ

تعجب ہے وہ دنیا جس میں شادمانی بغیر ماتم کے، خوشی بغیر غم کے، زندگی بغیر موت کے، صحت بغیر مرض کے، بقا بغیر فنا کے، مراد بغیر درد و دغا کے، آب و دانہ بغیر تکلیف و بلا کے ملنا محال ہے، پھر بھی ایک عالم ہے کہ اس کی جستجو میں فتنوں کا شکار بنا ہوا ہے۔"

"لیکن اے برادر! دنیا میں اتنی زیادہ برائیوں کے باوجود ایک بڑا ہنر یہ بھی ہے کہ دنیا ہی میں آخرت کی کھیتی ہوتی ہے۔ خاص کر نیکی کمانے والوں کے لیے۔"

اسی لیے حضرت مخدوم ترک دنیا پر بہت زور دیتے ہیں۔ آپ خدا والوں کی پہچان یہ بتاتے ہیں کہ "وہ دنیا ترک کر دے اور دنیا دار کی صحبت سے دور رہے۔"[1] مزید فرماتے ہیں کہ:

"مجھے[2] تو یقین ہے کہ جہاں ترک دنیا نہیں معرفت خداوندی نہیں۔ ترک دنیا اور معرفت حق ایک نفی اور ایک اثبات۔ کلمۂ شہادت ان ہی دونوں سے مرکب ہے۔ جس نے دنیا ترک کی اس نے نفی کی جس نے معرفت حق سے قربت کی اس نے اثبات کیا۔ لا الٰہ الا اللہ میں اسی کا اعلان ہے۔ صرف زبان سے ان حروف کا ادا کرنا کافی نہیں۔ اے عزیز! یہ حال کہ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہیں اور دنیا کے سامنے سجدہ

---

[1] مکتوب [2] مکتوبات دو صدی ص ۴۶۸

امرا و سلاطین کو اپنا قبلہ بنائیں یہ تو ایمان زبانی اور کفر دلی کا اظہار ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

مصحف بکف گرفتہ کفر در و نہفتہ بطال مست خفتہ بر بستر ریائی

اے عزیز! یہ بات تو معلوم ہے کہ آج کل کا کیا حال ہے؟ کافی مخلوق ایسی ہے جو ایک جانب معرفت خداوندی کا دعویٰ رکھتی ہے۔ دنیا اس کو راہِ حق سے ہٹا کر دور لے گئی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو خبر تک نہیں کہ نمرود اور فرعون کا بھی یہی حال تھا۔"

ترک دنیا کا مفہوم

لیکن ترک دنیا کا مطلب یہ نہیں کہ انسان رہبانیت اختیار کرے اور لازمی ضروریاتِ زندگی سے بھی کنارہ کش ہو جائے۔ اصل مقصد فضول باتوں اور لہو و لعب کا ترک ہے۔ اس کی وضاحت ایک مکتوب میں یوں کی گئی ہے:

"اے عزیز![1] اس موقع پر ایک چیز کا ضرور خیال رکھنا چاہیے تاکہ غلطی نہ ہو۔ ترک دنیا سے مطلب فضول باتوں کا ترک ہے۔ لازمی ضروریات اور طبعی احتیاج کا ترک نہیں۔ بلکہ جس طرح فضولیات کی طلب ناپسندیدہ اور حجاب راہ ہے اسی طرح ضروریات کا ترک ناپسندیدہ اور مانع ہے۔ ہر آدمی کو تھوڑی غذا۔ کچھ کپڑے اور مختصر سے مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان چیزوں کو ترک کر دیا جائے تو لازماً آدمی دوسرے کا محتاج ہوگا، اور مایحتاج کی خواہش دل میں پیدا ہو گی۔

اس طرح انسان بلا میں پڑ کر ہلاک ہو سکتا ہے۔ اس لیے جس طرح فضولیات کی طلب انتہائے فساد کا سبب بنتی ہے، ضروریات ناگزیر کا ترک بھی فساد میں مبتلا کر سکتا ہے۔

---

[1] مکتوب ۵۸، مکتوبات دو صدی ص ۴۶۸

اے عزیز! اگر کوئی شخص اس موقع پر یہ فضول بحث چھیڑ دے کہ حضرت ابوبکرؓ کی ایک مثال ہے کہ تمام سامان بیت المال میں ڈال دیا تھا اور جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو تو جواب دیا کہ اللہ اور اس کے رسول کافی ہیں۔ پھر کیسے ضروریات پر زور ڈالا جاتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے اپنے حال پر غور کرو۔ کیا تم حضرت ابوبکرؓ کی طرح ایسا کرنے کے بعد بنا ہ بھی سکو گے؟ اگر تم میں اس کی استطاعت ہے تو ایسا کر سکتے ہو۔ لیکن ساگ بینگن بیچنے والوں کو کیا حق ہے کہ بادشاہ کا مقابلہ کرے۔"